یٰسین آفاقی
ایسوسی ایٹ پروفیسر، اسلام آباد کالج فار بوائز
جی سکس تھری، اسلام آباد

اُردو تنقید میں روایت کا تصور

Yasin Afaqi
Associate Prof. Islamabad Collage For Boys
G-6/3, Islambad.

The Concept of Tradition in Urdu Criticism

There are many unresolved problems in Urdu literature and tradition is one of the most intractable. The concept of tradition is necessary to demonstrate the process of literary change and is indispensable to establish the original meaning of a text and to reveal the total structure of a literary work. The article discusses concept of tradition with special emphasis on the views of T.S. Eliot, Muhammad Hasan Askari and Anis Nagi. While elaborating and analyzing their views the writer of this article evolves a view that there is room enough for writing on this subject because it is still a bone of contention.

اُردو تنقید میں روایت کے تصور پر سنجیدگی سے غور و فکر کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس سلسلے میں محمد حسن عسکری نے پہل کی۔ زیادہ تر قارئین جدید اردو تنقید میں روایت کے مباحث کو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اثرات میں شمار کرتے ہیں۔ محمد حسن عسکری کا کہنا ہے کہ ''ایلیٹ کے اثر سے روایت کا لفظ فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔''[1] ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''ایلیٹ صاحب کو دعویٰ ہے کہ ان کے ذہن میں روایت کا واضح تصور موجود ہے اور آج کل کی انگریزی تنقید میں اور اس کے اثر سے خود اردو کی تنقید میں روایت کا چرچا انہیں کے فیض سے ہوا ہے۔''[2] ناصر عباس نیّر کے نزدیک یہ بات ایک حد تک ہی درست ہے۔ ''اصل یہ ہے کہ اردو ادب میں جدید رجحانات کی آمد کے ساتھ ہی روایت معرضِ بحث میں آ گئی تھی۔ قدیم و جدید جب مقابل آتے ہیں تو دونوں میں ٹکراؤ لازماً ہوتا ہے۔''[3] کسی چیز کا معرضِ بحث میں آنا ایک الگ چیز ہے اور اس پر بحث و تمحیص کا فیشن کی حدود میں داخل ہونا ایک دوسری بات ہے۔ بہ ہر حال اردو تنقید میں روایت کا تصور فیشن کی حدود میں ایلیٹ کے اثر سے ہی داخل ہوا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اردو تنقید میں جدید رجحانات کے سلسلے میں روایت کا تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ ہمارے قدامت پسند اُدبا نے اس سے استمداد لے کر جدیدیت کو رد کیا ہے۔ اس تناظر میں روایت کا مفہوم متعین کرنے کے لیے سب سے پہلے ایلیٹ کے تصورِ روایت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

ایلیٹ کی نظر میں تمام عظیم ادبی فن پارے ایک سلسلہ میں منظّم و مرتب ہوتے ہیں۔ اور نقاد کا کام یہ ہے کہ وہ ان عظیم فن پاروں کو نئی صورت حال کے پیشِ نظر نئی ترتیب و تنظیم کے ساتھ پیش کرے۔ اس کام کے لیے ادبی روایت سے آگاہی لازم ہے۔ اس لیے ایلیٹ روایت کی ضرورت واہمیت پر زور دیتا ہے۔ محمد حسن عسکری نے ایلیٹ کے حوالے سے اس بات کو یُوں کہا ہے ''روایت کا دارومدار عقائد پر نہیں، عقائد تو روایت کی تشکیل کے دوران میں زندہ صورت اختیار کرتے ہیں۔''[۴] ایلیٹ کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: ''اگر عقیدے اسی طرح پیدا ہوتے ہیں تو مذہب اچھا خاصا تماشا بن جاتا ہے۔ قصّہ یہ ہے کہ ایلیٹ صاحب اپنی مذہبیت کے باوجود عقیدے کے لفظ سے اتنا ہی بھڑکتے ہیں جتنا گبن۔ دراصل یورپ کو معلوم نہیں کہ عقیدہ کیا چیز ہے۔''[۵] آگے لکھتے ہیں: ''یورپ میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کی وجہ ایلیٹ صاحب معاشی اور صنعتی بتاتے ہیں۔ اگر کپڑے دھونے کی مشین کے ساتھ ساتھ عقیدہ بھی بدل سکتا ہے یا نشوونما پا سکتا ہے تو ایسے عقیدے کی قدر و قیمت ہی کیا۔''[۶] عسکری کے نزدیک رومن کیتھولک ایلیٹ فی الجملہ عقیدے کو اسی سطح پر لے آتے ہیں۔ روایت کی تعریف بیان کرتے ہوئے ایلیٹ لکھتا ہے: ''روایت وقیع ترین مذہبی رسوم سے لے کر سلام کرنے کے طریقے تک ان سارے افعال کا مجموعہ ہے جو ایک جگہ رہنے والے اور ایک نسل کے لوگوں کے لیے معمول بن گئے ہیں۔''[۷] ایلیٹ کے اس بیان سے عسکری یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ روایت کا مطلب ہے عادت اور عادت تو بڑی کمزور چیز ہے۔ عادت کو زندہ رکھنے پر اتنا زور کیوں؟ عسکری کا کہنا ہے کہ ایلیٹ نے روایت کے متعلق شور مچا کے مسئلے کو اُلجھا دیا ہے۔ اس ضمن میں سلیم احمد لکھتے ہیں:

> ''عام طور پر ہم ہر اس چیز کو روایت کہ دیتے ہیں جو ہم نے کسی وجہ سے عارضی یا مستقل طور پر اختیار کر لی ہو۔ ان معنوں میں روایت صرف ایک طرح کی عادت کا نام ہے۔ اس سے یہ غلط خیال پیدا ہوا کہ ایک تہذیب میں بیک وقت مختلف بلکہ متضاد روایتیں موجود ہوتی ہیں جو اپنی اپنی جگہ مستقل وجود رکھتی ہیں اور اُنھیں حسبِ منشا ترک یا تبدیل کیا جا سکتا ہے۔''[۸]

ایلیٹ کے خیال میں روایت کوئی غیر مبدل اور ساکن چیز نہیں یعنی جسے بدلا نہ جا سکے اور جو اپنی جگہ ٹھہری رہے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایلیٹ کے نزدیک روایت کا دارومدار عقائد پر کیوں نہیں، کیوں کہ ان کے بقول عقیدہ بھی بدل سکتا ہے یا نشوونما پا سکتا ہے۔ عسکری کے نزدیک ایلیٹ عقیدے کے لفظ سے بھڑکتے ہیں۔ شاید اسی لیے سجاد باقر رضوی نے عقائد کی جگہ تعصّبات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ عسکری کے بیان کی رو سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایلیٹ کے تصورِ روایت کا دارومدار عقائد پر نہیں تو پھر کس چیز پر ہے؟ اور سجاد باقر رضوی کے بیان کے مطابق اگر روایت کا مطلب چند تعصّبات کو برقرار رکھنا نہیں ہے تو کیا بہت سے تعصّبات کو قائم رکھنا روایت ہے۔ یا پھر کس چیز کو برقرار رکھنا روایت ہے؟ اگر روایت کے تشکیلی عمل میں عقائد زندہ صورت اختیار کرتے ہیں اور وجود میں آتے ہیں تو پھر ان پر روایت کا انحصار کیوں نہیں جو خود تبدیل ہونے والی شے ہے۔

سجاد باقر رضوی کا کہنا ہے کہ ایلیٹ کے نزدیک روایت کے یہ معنی نہیں کہ محض چند تعصّبات کو برقرار رکھا جائے، اس لیے کہ تعصّبات تو روایت کے تشکیلی عمل کے دوران وجود میں آتے ہیں۔ اس کے نزدیک: ''اگر روایت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے سے پہلی نسل کے طریقوں اور کامیابیوں کا آنکھ میچ کر یا سہمے سہمے اتباع کیا جائے تو ایسی صورت میں یقیناً روایت کی حمایت سے گریز کرنا

چاہیے۔"[۹] ایلیٹ کے نزدیک روایت کا معاملہ بہت وسیع اہمیت کا حامل ہے۔ یہ میراث میں نہیں ملتی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے بڑے ریاض کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایلیٹ اس کے لیے تاریخی شعور کو لازمی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تاریخی شعور ادیب کو مجبور کرتا ہے کہ لکھتے وقت جہاں اسے اپنی نسل کا احساس رہے وہاں یہ احساس بھی رہے کہ یورپ کا سارا ادب ہومر سے لے کر اب تک، اور اس کے اپنے ملک کا سارا ادب ایک ساتھ زندہ ہے اور ایک ہی نظام میں مربوط ہے۔ یہ تاریخی شعور، جس میں لازمان اور زبان کا شعور الگ الگ اور ساتھ ساتھ شامل ہے، وہ چیز ہے جو ادیب کو روایت کا پابند بناتا ہے اور یہی وہ شعور ہے جو کسی ادیب کو "زماں" میں اس کے اپنے مقام اور اپنی معاصرت کا شعور عطا کرتا ہے۔"[۱۰]

ایلیٹ کے تصورِ روایت کے حوالے سے حامدی کاشمیری کہتے ہیں:

"ایلیٹ نے برگساں کے مرورِ زماں کے تصور کی مانند ادب میں روایت کے شعور کو وقت اور جگہ کی حد بندیوں سے بالاتر قرار دیا ہے۔ اس نے ادب کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے کے تصور کو مسترد کرتے ہوئے اسے زمانی تناظر میں ایک مسلسل growth کی صورت میں دیکھا ہے۔"[۱۱]

ناصر عباس نیّر ایلیٹ کے تصور روایت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایلیٹ روایت سے مراد وہ نظام لیتا ہے جو تمام یورپی ادب میں موجود اور کارفرما ہے اور اس ادب کو ایک زندہ وحدت میں بدلتا ہے۔ مگر یہ نظام فرد کو وارثتاً منتقل نہیں ہوتا، تاریخی شعور کی مدد سے اسے حاصل کرنا ہوتا ہے اور اس کے لیے سخت ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ روایت میں زمانیت اور لازمانیت دونوں عناصر ہوتے ہیں۔ یعنی فن کار موجود اور گزرے ہوئے زمانوں سے (گزرے زمانے کے مردہ اور زندہ عناصر کے فرق اور شعور کے ساتھ) منسلک ہوتا ہے۔"[۱۲]

ایلیٹ تاریخی شعور پر بہت زور دیتا ہے اور اس کا مطلب اس کی نظر میں یہ ہے کہ ادیب کو زمانیت او لازمانیت دونوں کا احساس اور شعور الگ الگ بھی ہو اور ایک ساتھ بھی۔ اس کے نزدیک ایسے ہی احساس کے ساتھ روایتی ادب تخلیق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے بقول ایلیٹ کے نزدیک شاعر کے روایتی ہونے کے لیے یہ ضروری ہے:

"اسے زندگی اور ادب میں ابدی و فانی دونوں قسم کے عناصر کا شعور ہو، ساتھ ہی ابدی و فانی دونوں عناصر کا اکٹھا شعور ہو۔ یہی وہ شعور ہے جس کے باعث شاعر کو اپنے زمانے کا شعور ہوتا ہے، اور اس شعور کے باعث وہ خود اپنا ہم عصر بن جاتا ہے۔"[۱۳]

یہی تاریخی شعور اور روایت کا احساس ہے جس کی مدد سے ادب کی صحیح جانچ پرکھ اور اعلیٰ تخلیق ممکن ہے۔ ایلیٹ کا کہنا ہے کہ ہم کسی شاعر کی تحسین کے دوران اس کی تخلیقات کے ان پہلوؤں پر زور دیتے ہیں جہاں وہ دوسرے شعرا سے کم سے کم مماثلت رکھتا ہے۔ اس کی شاعری کے ان حصوں اور پہلوؤں سے اس کی انفرادیت اور اصل جوہر کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس شاعر

اور اس کے پیش روؤں اور خاص طور پر اس کے قریبی پیش روؤں میں جو فرق ہے اس پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں اور بالخصوص ان خصوصیات کی ٹوہ لگاتے ہیں جو اس شاعر کو دوسرے شاعروں سے منفرد اور ممتاز بناتی ہیں لیکن اگر کسی شاعر کا مطالعہ بغیر اس تعصب کے کریں تو یہ احساس ہوگا کہ: ''اس کی شاعری کے نہ صرف بہترین بلکہ منفرد ترین حصے بھی ایسے ہیں جن میں مرحوم شعرا اور اس کے اسلاف اپنی 'لافانیت' کو زیادہ شدت کے ساتھ ظاہر کر رہے ہیں۔''[۱۴] روایت کے تصور کا یہ وہ پہلو ہے جسے ایلیٹ شخصی و انفرادی رجحانات کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ اس کے مطابق تنقید کا یہ رجحان درست نہیں جس کی رو سے کسی شاعر کی تعریف اس کی شاعری کے ان عناصر کے سبب کی جاتی ہے جو اس کی شاعری میں بالکل الگ اور دوسرے تمام شعرا سے مختلف ہوتے ہیں۔

محمد حسن عسکری نے اپنے مضمون ''روایت کیا ہے؟'' میں لکھا کہ ''روایت کے معنی سمجھے بغیر ادب چل نہیں سکتا اور مغرب روایت کے معنی سمجھنے میں بالکل ناکام رہا ہے۔''[۱۵] سوال یہ ہے کہ محمد حسن عسکری کے نزدیک روایت کے معنی کیا ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ جان لیا جائے کہ محمد حسن عسکری سے پہلے روایت کا کیا تصور رہا ہے؟ مختلف لوگوں نے مختلف انداز میں روایت کا تصور پیش کیا ہے۔ بالعموم عسکری سے پہلے اردو میں روایت کا تصور کچھ اس طرح تھا کہ روایت بدلتی رہتی ہے، پُرانی ہوتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں:

> ''سرور صاحب کے یہاں، احتشام صاحب کے یہاں، سب کے یہاں یہ خیال مل جائے گا کہ روایت ایک پُرانی سی چیز ہے جو کبھی پیدا ہوئی ہوگی کسی زمانے میں۔ اسے لوگوں نے اختیار کیا، یا وہ لوگوں پر اثر انداز ہوئی۔ لیکن زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ وہ بدلی نہیں، جامد ہو کر رہ گئی۔ اس کی ذات میں ہی کچھ عیب موجود تھا، اس میں کچھ فساد بھی تھا۔ کچھ صالح اور غیر صالح عناصر سے مل کر روایت بنی۔ اور عسکری کے پہلے لوگ یا تو روایت کر مسترد کرتے تھے مثلاً اختر حسین رائے پوری، یا ترقی پسند مفکرین اور کچھ دوسرے یہ کہتے تھے کہ روایت کے صالح حصے کو تو ہم لے لیں اور اس غیر صالح حصے کو ہم چھوڑ دیں۔ جو کچھ اس میں فاسد ہے، مفسدہ ہے، اس کو ہم چھوڑ دیں اور جو اس میں اصلاح پذیر ہے اس کو قبول کر لیں۔''[۱۶]

شمس الرحمٰن فاروقی اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''لیکن انھوں نے رسمی باتیں کہنے کے سوا کبھی واضح نہیں کیا کہ ''فاسد / غیر فاسد، ''صالح / غیر صالح'' جیسی اصطلاحوں سے ان کی کیا مراد ہے۔۔۔ اور یہ انھوں نے کبھی منطقی یا تاریخی طور پر ثابت نہیں کیا کہ روایت کوئی پرانی چیز ہے جو ایک جگہ جامد ہو کر رہ جاتی ہے۔ بس دعویٰ ہی کرتے رہ گئے۔''[۱۷]

یعنی عسکری سے پہلے تصورِ روایت یہ تھا کہ یہ ایک انسانی چیز ہے۔ کل تھی اور آج نہیں ہے۔ کل اس طرح تھی اور آج بدل کر یُوں ہوگئی۔ کل اس کا کچھ حصہ ہم نے ترک کر دیا تھا اور آج اس میں کچھ نئی چیزیں ڈال دی ہیں۔ یہ سوال کہ روایت سے کیا مراد ہے۔ عسکری کا خیال ہے کہ اس سوال کا جواب مغرب میں رُنے گینوں نے دیا ہے۔ اس کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''روایتی ادب اور روایتی فنون صرف روایتی معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں اور روایتی معاشرہ وہ ہے جو

مابعدالطبیعیات کی بنیاد پر قائم ہو۔ مابعدالطبیعیات چند نظریوں کا نام نہیں التوحِیْدُ واحِد'' مابعدالطبیعیات صرف ایک ہی ہوسکتی ہے، یہی اصل اور بنیادی روایت ہے اس کا تعلق کسی نسل یا ملک سے نہیں البتہ اس کے اظہار کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں۔''[۱۸]

حسن عسکری نے روایتی ادب اور فنون کا رشتہ روایتی معاشرے کے ساتھ اُستوار کیا ہے اور مابعدالطبیعیات کو اس معاشرے کی اساس گردانا ہے۔ یوں وہ روایت کو مابعدالطبیعیاتی اُصولوں پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مابعدالطبیعیات کیا ہے؟ عسکری شاہ وہاج الدین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جب آپ وجودِ مطلق کو بلالحاظِ تعینات یاد کریں گے تو یہ وجودِ باری ہے۔ اور جب بلحاظِ تناسب تعینات محسوس کریں گے تو یہ روحانیات ہے۔ جب بلحاظ اعراض دیکھیں گے تو یہ مادیت ہے، وجودِ انسانی سے مراد وجودِ مطلق ہے۔ روحِ انسانی سے مراد وہ روح ہے جو مجموعۂ تعیناتِ انفسی و آفاقی ہے۔ جسم انسانی سے مراد خلاصۂ مادیاتِ انفس و آفاق ہے۔''[۱۹]

عسکری کے نزدیک یہ وہ تصور ہے جو روایت کی بنیاد ہے۔ ادب اس تصور کی اساس پر استوار ہونے کی صورت میں روایتی ہے، ورنہ نہیں، چاہیے الفاظ اور اسالیب روایتی استعمال ہو رہے ہوں۔ اس مابعدالطبیعیات سے ادب کو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے چند اُصول بھی نکلتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انسان کے پیشِ نظر معرفت کے لیے صرف دو ہی تعینات ہیں، انفس اور آفاق۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''تکمیل اس میں ہے کہ دونوں کی شناخت ایک ساتھ ہو اور انفس کی شناخت کو آفاق کی شناخت پر غلبہ ہو۔ کیوں کہ آفاق جسم ہے اور انفس اس کی روح ہے کیوں کہ آفاق میں کسی چیز کو وجود بلاانفس کے ادراک کے پایا نہیں جاتا ہے۔ پس رونگٹا رونگٹا انفس کا آفاق کے لیے عالم عالم ہے۔ اسی لیے پچھلی صدیوں سے شاعری ہر زبان کی بشمول آفاق انفس کو غلبہ دے کر مکمل سمجھی گئی ہے اور بااعتبار مشرب ہر ملت وقوم کے معشوق انفس ہی کو قرار دیا گیا ہے۔''[۲۰]

عسکری کے بقول ان اقتباسات کے ذریعے نہ صرف روایت کا ایک مفہوم متعین ہو جاتا ہے بلکہ روایتی نقطۂ نظر سے کسی ادب پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کا بھی ایک معیار ہاتھ لگ جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسی ادبی تنقید اردو میں مشکل سے ملے گی۔ انھوں نے ایک ایسا معیار مقرر کر دیا ہے جو دنیا بھر کے ادب پر حاوی ہے۔ ''وقت کی راگنی'' کے ایک دوسرے مضمون ''اُردو ادب کی روایت کیا ہے؟'' میں عسکری اپنے تصورِ روایت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مشرق کی حد تک تو مسئلہ بالکل واضح ہے۔ مسلمان ہوں یا ہندو یا بدھ سب کا اتفاق دو چیزوں پر تو ہے ہی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ معاشرتی روایت، ادبی روایت، دینی روایت یہ الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک بڑی اور واحد روایت ہے جو سب کی بنیاد ہے اور باقی چھوٹی روایتیں اسی کا حصہ ہیں اور اسی سے نکلی ہیں۔ اسلامی اصطلاح کے مطابق اسی بنیادی روایت کا نام ''دین'' ہے۔ ثانوی روایتوں میں شامل ہونے کے لیے اس بنیادی روایت میں شامل ہونا

لازمی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ بنیادی روایت نکلتی ہے کسی آسمانی یا مقدس کتاب سے، پھر اس کی وضاحت کرتے ہیں اس روایت کے مستند نمایندے، اور صرف انہی نمایندوں کا قول استناد کے قابل ہوتا ہے، پھر ایک تیسری بات ہے جو ہر زبان میں خود لفظ ''روایت'' کے مفہوم کا لازمی جز ہے یعنی روایت وہ چیز ہے جو ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک پہنچائی جائے۔''[۲۱]

اپنی کتاب ''جدیدیت'' میں عسکری لکھتے ہیں:

''صرف اسلام ہی نہیں بلکہ مشرق کے سارے ادیان کا انحصار زیادہ تر زبانی روایت پر ہے، لکھی ہوئی کتابوں پر نہیں۔ ہمارے نزدیک کسی دین کے زندہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ روایت شروع سے لے کر آج تک کلی حیثیت سے سلسلہ بہ سلسلہ اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آ رہی ہو۔''[۲۲]

سلیم احمد، عسکری کے تصورِ روایت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عسکری صاحب وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے ہمیں بتایا کہ روایت سب سے پہلے ایک مابعدالطبیعیاتی نظام ہے۔ پھر اس سے کسی تہذیب کی ساری شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ مذہب، اخلاق، معاشرت اور علوم وفنون کے سارے اصول مابعدالطبیعیاتی نظام سے اخذ کیے جاتے ہیں، اور اسی کے تابع ہوتے ہیں پھر زندگی کے مختلف شعبوں کے اُصول ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے سے مربوط اور ایک کُل کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انھیں وقتی ضرورت یا پسند ناپسند کی بنا پر تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنا مستقل وجود رکھتے ہیں اور ان میں کسی بھی تبدیلی کے معنی مابعدالطبیعیاتی گمراہی کے ہیں۔''[۲۳]

عسکری کا روایت کا تصور کیا ہے؟ اس ضمن میں ڈاکٹر تحسین فراقی رقم طراز ہیں:

''عسکری کے ہاں روایت کا لفظ عادت کے طور پر استعمال نہیں ہوا بلکہ روایت سے مراد وہ چیز ہے جس کا تعلق مابعدالطبیعیاتی اُصولوں سے ہو۔ اِس لیے کہ اِن اُصولوں کے ساتھ حقیقت کا ایک واضح تصور منسوب ہوتا ہے۔ حقیقت کا تصور چوں کہ ہر جگہ ایک ہے اس لیے اصلی اور بنیادی روایت بھی ایک ہے۔ اس میں نہ اختلاف ہوسکتا ہے نہ تضاد، نہ وہ نئی ہوسکتی ہے نہ پرانی۔''[۲۴]

ایلیٹ کے تصورِ روایت کا جائزہ لیتے ہوئے عسکری نے لکھا: ''ایلیٹ صاحب کے نزدیک تو روایت بدل بھی سکتی ہے، لیکن ابن عربی کے تصورات کی تو پہلی شرط ہی یہ ہے کہ ان میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں۔''[۲۵] عسکری کا کہنا ہے کہ مغرب میں ہر ادیب نے روایت کا ایک الگ تصور قائم کر رکھا ہے۔ ایک نقاد جس کتاب یا مصنف کو روایت میں شامل کرتا ہے، دوسرا اسی کو خارج کرتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ نتیجتاً اس لفظ میں معنی ہی نہیں رہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی نظر میں عسکری کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے روایت کے معنی بدل دیے۔ اس کی ایک بالکل نئی تعریف متعین کر دی۔ عسکری کے تصور روایت کے حوالے سے وہ کہتے ہیں:

"روایت ایک زندہ اور متحرک چیز ہے۔ اور ہمیشہ ادب کے اندر قائم رہتی ہے۔ اور یہ ایک sameless whole ہے۔ اسے پورا پورا قبول کرنا پڑتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی ادبی روایت کا دو تہائی حصہ تو ہم نے لے لیا اور فلاں روایت کا چوتھائی حصہ وہاں سے لے لیا۔ یا کبھی کہہ دیا کہ یہ روایت آج سے بند اور نئی روایت آج سے شروع۔ تو یہ نہیں ہوسکتا ہے۔ روایت تو ایک نامیاتی کُل ہے جو کہ ادب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ بے شک، ادب اس پر اثر انداز ہوتا ہے اور بے شک، ادب پر وہ اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اسے منطقوں، یا تاریخی خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ آپ اس پر کاٹ چھانٹ نہیں کر سکتے کہ یہ لے لیا وہ چھوڑ دیا۔ تو اس میں کوئی تصور فرسودگی کا نہیں ہے۔"[۲۶]

عسکری کے تصورِ روایت کی وضاحت کرتے ہوئے وہ مزید کہتے ہیں:

"روایت synchronic چیز ہے۔ یہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ہر زمانے میں موجود رہتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عسکری نے کہا روایت کی اصل جو ہے وہ زبانی بیانات میں ہے، تحریر میں نہیں آتی۔ جو چیز کہ زبان پر رواں رہتی ہے، جاری رہتی ہے، اس سے روایت بنتی ہے، کیوں کہ اس میں تحریر کی سی غلطی ہونے کا امکان کم ہوتا ہے۔ اگر کسی نے غلط تقریر کی بھی تو اس کو درست کر لیا جاتا ہے۔ عام طور پر ہم جو سمجھتے ہیں اس سے یہ الٹی بات ہے۔ لیکن اس کے پیچھے افلاطون کا تصور پنہاں ہے۔ افلاطون نے کہا تھا۔ لکھا ہوا متن اگر غلط ہے تو اسے اپنی اصلاح کرنے کی قوت نہیں۔"[۲۷]

شمس الرحمٰن فاروقی کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ روایت کے اندر اپنی اصلاح کر لینے کی قوت مضمر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روایت ایک سے دوسرے تک فوری طور ہو، بالمشافہ پہنچتی ہے۔ جب تک روایت رواں دواں رہتی ہے، یہ سینہ بہ سینہ ایک سے دوسرے تک آتی رہتی ہے۔ اگر روایت چلتی رہے تو اس میں کھوٹ یا فساد کا امکان بہت کم ہوتا ہے، بلکہ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تحریر میں غلطی ہوگی تو اس کی درستی کا امکان نہیں ہوتا۔ کیوں کہ تحریر بہ ظاہر بڑی طاقت ور معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں اپنی اصلاح کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اصلی روایت وہ ہے جو زبانی طور پر مروج ہو اور ایک سے دوسرے تک مسلسل پہنچے۔ یوں عسکری نے روایت کا تصور ہی بدل کر رکھ دیا۔ لیکن شمس الرحمٰن، فاروقی عسکری کے اردو ادب کی روایت کے تصور کو من وعن قبول نہیں کرتے۔ وہ عسکری سے بعض جگہوں پر اختلاف بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں خود میں پہنچا ہوں ان کی تعلیمات کے بغیر وہاں میرے لیے پہنچنا ممکن نہ تھا۔ مثال کے طور پر عسکری کہتے ہیں کہ اردو کی حد تک ہماری اسلامی روایت ہے اور فاروقی یہ کہتے ہیں: "یہ روایت ہند+مسلم نہ کہیے، ہند+ایرانی کہیے، ہند + عرب + ایرانی کہیے"[۲۸] فاروقی کے نزدیک اس روایت میں جو تصورات داخل ہوئے ہیں وہ ہندو اور مسلم دونوں طرف سے لائے گئے ہیں لیکن عسکری کا یہ کہنا ہے کہ توحید کا تصور تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک ہے کہ 'التوحِیدُ واحِد' لیکن اس کے آگے عسکری کا کہنا ہے کہ ہمارے یہاں ادبی روایت کی تشکیل یا ترقی میں جو تصورات بروئے کار آئے ہیں، وہ درحقیقت خالص اسلامی تصورات ہیں۔ اور اسلامی تصورات میں بھی وہ جن کا رشتہ براہِ راست عقلیت کوش اور ماورائی تصوف یا Intellectual sufism سے جڑ جاتا ہے یعنی تصوف کی اس شکل سے جو عملی نہیں ہے، صرف فکری ہے۔ جو تصوف عملی دنیا میں کارآمد ہے، اس پر عسکری کم گفت گو کرتے ہیں۔ لہٰذا فاروقی کے نزدیک اردو کی ادبی روایت کو انھوں

نے دو طرح سے محدود کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

''ایک تو انھوں نے اسے محدود کیا محض اسلامی روایت تک، اسلامی تصورات تک، اور دوئم اس کو پھر محدود کیا اسلامی روایت اور اسلامی تصورات کے اس پہلو تک جس کا تعلق ذہنی اور تعقلاتی تصوف سے ہے۔ لہٰذا وہ ایک مخصوص قسم کی Elitist روایت بن کر رہ گئی۔ چناں چہ ہندوستان کی جو مخلوط تہذیب ہے، جو مخلوط تاریخی شعور ہے اور اردو ادب جس کا کہ کُلِ سرسبد ہے، اس کا بہت بڑا حصہ اس روایت میں سے چھٹ گیا۔''۲۹

روایت کے معنی نئے سرے سے قائم کرنا حسن عسکری کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے روایت کی ضرورت، اہمیت اور مرکزیت اردو والوں پر واضح کی۔ روایت کی قوت سے اُنھیں ہم کنار کیا۔ لیکن انھوں نے اردو کی ادبی روایت کو محدود کر دیا۔ لیکن ساٹھ کی دہائی سے پہلے عسکری کے نزدیک روایت کا یہ تصور نہیں تھا۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۴ء میں انھوں نے نیاز فتح پوری کی طرف سے جدید اردو نظم پر عائد کیے جانے والے اعتراضات کے جواب میں اپنے مضمون ''جدید شاعری'' میں لکھا:

''شعری تکنیک مغرب سے مستعار لینے میں کوئی شرم کی بات نہیں اور نہ یہ محکومیت کی علامت ہے۔ یہ تو ایک آزادانہ ثقافتی لین دین ہے۔ آزاد نظم کو اختیار کرنے کی اگر کوئی اور وجہ نہ ہوتی تو میرے خیال میں یہی بہت کافی تھی کہ یورپ میں اس کا استعمال ہوا ہے۔''۳۰

آگے لکھتے ہیں: ''ہر قوم اور زبان کا علم و ادب ساری دنیا کی مشترکہ جائیداد ہے۔ روایت کا مفہوم اتنا تنگ نہیں کہ باہر کی کوئی چیز اس میں شامل ہی نہ ہو سکے۔ ادب کی تاریخ اس مفہوم کی تردید کرتی ہے۔''۳۱ عسکری نے مغرب سے شعری تکنیک مستعار لینے کو آزادانہ ثقافتی لین دین سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں روایت ایک بڑھنے اور پھیلنے والی چیز ہے جو عجیب سے عجیب تجربے کو بھی اپنا سکتی ہے۔ عسکری کے بقول اگر اپنی روایت کی توسیع کرنے کا احساس ان لوگوں میں نہ ہوتا تو ہمیں نہ چوسر نظر آتا نہ شیکسپیئر، نہ ملٹن، نہ پروست، نہ جوئس۔ اُس وقت ان تجربات سے قومی و نسلی خصوصیات کو کوئی خدشہ نہیں تھا لیکن بعد میں خطرہ لاحق ہوا۔ ممکن ہے ۱۹۴۴ء میں انھیں قومی و نسلی اور تہذیبی خصوصیات کا مکمل ادراک نہ ہو، لیکن ان خصوصیات کی پرچھائیاں ان کے شعور میں ضرور موجود تھیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تحسین فراقی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ: ''عسکری کے ہاں یہ قلب ماہیت ناگہانی طور پر نہیں ہوئی کہ وہ ایک جون سے دوسری جُون میں تبدیل ہو گئے بلکہ اس کی ایک باقاعدہ تدریج بنتی ہے۔''۳۲ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۲ء کے بعد ان کے ہاں روایت کا مفہوم کچھ اس قسم کا ہو گیا کہ مغرب کی کوئی چیز اس میں سما نہیں سکتی تھی۔

ساٹھ کی دہائی میں عسکری کی فکر میں روایت، مابعدالطبیعیات، معرفت، عقل کل وغیرہ الفاظ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ نامناسب نہ ہوگا کہ عسکری کے روایت اور مابعدالطبیعیات کے تصور کے ضمن میں ساجد علی کے اختلافات کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ ساجد علی کے خیال میں عسکری نے مذہب، تصوف، فلسفہ اور سائنس کے مسائل پر اس انداز سے رائے زنی کی ہے کہ اُن کے علم، بصیرت، ذہانت اور فہم پر شبہ سا ہونے لگتا ہے۔ وہ عسکری کے کلیدی تصورات کے تفصیلی دلائل معلوم کرنے کے لیے ان کی کتابوں ''وقت کی راگنی'' اور ''جدیدیت'' کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان کی فکر کے مرکزی نکات کا بالتفصیل تجزیہ کرنے کے بعد اس

نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عسکری صاحب جسے نجات اور عرفان کا راستہ بتاتے ہیں، وہ درحقیقت قرآن سے انحراف، گریز اور تجاوز کا راستہ ہے۔ وہ عسکری سے اپنے اختلاقی نکات کو یوں پیش کرتے ہیں:

۱۔ ’’عسکری صاحب کا یہ دعویٰ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ تمام ادیان خصوصاً اسلام کا انحصار زبانی روایت پر ہے۔

۲۔ قرآن سے بالاتر کسی شخص کو دین میں سند قرار دینا شدید قسم کا فتنہ ہے۔

۳۔ عسکری صاحب اسلام، بدھ مت، ہندو اور چینی تہذیبوں کی جس مشترک مابعدالطبیعیات کا ذکر کر رہے ہیں، وہ اصلاً وحدتِ اَدیان کا فلسفہ ہے۔ یہ تصور مذہبی نہیں بلکہ سیاسی ضرورتوں کی پیداوار ہے۔ ہندوستان میں داراشکوہ سے لے کر ابوالکلام آزاد تک اس کے بہت سے چیمپیئن ہوئے ہیں۔ اسلام کا دوسرے مذاہب سے تعلق اُلفت و موَدّت کا نہیں برأت کا ہے۔ قرآن میں اس کی سب سے بڑی سند ’’سورۂ کافرون‘‘ ہے۔

۴۔ وحدت الوجود کا فلسفہ قرآن کے تصورِ توحید سے متصادم ہے، اپنی اصل کے اعتبار سے یہ فلسفیانہ ہے، مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔‘‘ ۳۳

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ عسکری کے تصورِ روایت اور مابعدالطبیعیات کا شمس الرحمٰن فاورقی اور ساجد علی کے کے اختلافات کی روشنی میں تنقیدی مطالعہ کیا جائے اور معلوم کیا جائے کہ اس میں کھرا کیا ہے اور کھوٹا کیا ہے؟ اس میں حق کتنا عیاں ہے اور باطل کتنا نہاں ہے؟ اس سے ایک تو ہماری ادبی وفکری روایت محدود نہیں ہوگی اور دوسرا کسی گمراہی میں مبتلا ہونے سے بھی بچ جائے گی۔

انیس ناگی نے نئی شعری روایت کی تلاش کے سلسلے میں روایت کے مسئلہ پر ازسرِنو غور وفکر کیا ہے۔ کیوں کہ روایت کے تصور کے بغیر نئی شعری روایت کی تلاش ایک لایعنی سا عمل ہے۔ ان کے نزدیک ایلیٹ نے روایت کی جو تشریح کی ہے وہ اتنی کشادہ ہے کہ روایت اور تمدن میں فرق باقی نہیں رہتا۔ اس تشریح کے مطابق بول چال، طرزِ احساس، طرزِ زیست، رسم و رواج، تمام روایت کی تشکیل کرتے ہیں۔ وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا روایت اور تمدن کو متبادل معنی میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟ انیس ناگی اس مسئلہ کو تخلیقی فنون کے حوالے سے دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’تمدن روایات کے اجتماع سے صورت پذیر ہے، روایات کی کئی ایک قسمیں ہوسکتی ہیں۔ مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور اساطیری، کسی معاشرے میں تمدن کی بنیاد روایت کی کسی ایک قسم پر نہیں ہوسکتی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور اساطیری روایات کے باہمی عمل اور تعمل سے تمدن کا اُسلوب متشکل ہے۔‘‘ ۳۴

سلیم احمد کا کہنا ہے کہ انیس ناگی نے عسکری اور ایلیٹ کے مقابلہ پر جو تصورات پیش کیے ہیں، اُن سے یہ پتا چلتا ہے کہ ناگی صاحب نے روایت کا بُرا بھلا تصور قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ روایت کا یہ تصور قطعاً غیر روایتی ہے۔ وہ انیس ناگی کے متذکرہ بالا اقتباس پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’کیا یہ صحیح ہے کہ روایات کی کئی قسمیں ہوتی ہیں؟ اچھا اگر ہوتی ہیں تو کیا ان روایات میں خود ایک مرکزی وحدت نہیں ہوتی جو مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور اساطیری روایات کو ایک لڑی میں پروتی ہے۔ اگر ہوتی ہے تو اس مرکزی

وحدت کو کیا کہتے ہیں؟ ہمارے نزدیک روایت کے اصل معنی یہی ہیں۔ مرکزی، بنیادی اصلی روایت تو ایک ہی ہوتی ہے اس کے بعد زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی روح مختلف شکلوں میں فعلیت پذیر ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو ان مختلف شکلوں کو ذیلی روایتیں کہہ سکتے ہیں۔"[۳۵]

سلیم احمد کے نزدیک ذیلی روایتیں بے شمار ہوسکتی ہیں مثلاً لباس کی روایت، دستر خوان کی روایت، نشست و برخواست کی روایت وغیرہ۔ لیکن مرکزی یا بنیادی روایت کے تعین کی ضرورت ہے جس سے باقی روایتیں نکلتی ہیں اور اس کے تابع ہوتی ہیں۔ روایت کا لفظ دراصل اس مرکزی روایت کے بارے میں استعمال کرنا درست ہے اور یہ ہمیشہ ہوتی ہے۔ چناں چہ سلیم احمد روایت کے اس تصور کو غلط قرار دیتے ہیں کہ ایک معاشرہ میں کئی قسم کی روایتیں ہوسکتی ہیں۔ سلیم احمد کے یہاں روایت کا مفہوم وہ ہے جو عسکری کے بعد کے مضامین میں پایا جاتا ہے جس کے مطابق روایت کا سرچشمہ ایک مابعدالطبیعیاتی نظام ہے، اگر ایک معاشرے میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہ رہے ہوں تو کیا وہ ایک ہی مابعدالطبیعیاتی نظام کے تحت زندگیاں گزارتے ہیں، کیا ہر مذہب میں مابعدالطبیعیات کا ایک ہی تصور کارفرما ہے، اگر نہیں تو کیا ایک معاشرے میں مختلف اور متفرق قسم کی روایتیں نہیں ہوں گی؟

روایت کے ضمن میں انیس ناگی کا دوسرا خیال یہ ہے کہ "روایت تمدن کی نسبت زیادہ علاقائی اور جغرافیائی ہوتی ہے۔"[۳۶] سلیم احمد کے نزدیک حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"تمدن علاقائی اور جغرافیائی اور روایت آفاقی ہوتی ہے۔ مثلاً اسلامی تہذیب جس مرکزی روایت پر قائم ہے جو عرب، عجم، ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیا اور افریقہ وغیرہ میں مشترک ہے جب کہ ان علاقوں کے تمدن جغرافیائی اور علاقائی ہیں۔ یہ اس مرکزی روایت کی آفاقیت ہی ہے جس کی بنا پر یہ سب تمدن اپنے اپنے اختلافات، امتیازات اور تنوع کے باوجود "اسلامی" سمجھے جاتے ہیں۔"[۳۷]

سلیم احمد نے اسلامی تہذیب کے حوالے سے جس انداز سے دلیل کی ساخت تشکیل دی ہے اس سے اُن کا یہ اعتراض بڑی حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انیس ناگی ایک مختلف زاویے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ایک ہی علاقے کے رسم و رواج میں اختلاف مختلف طبقوں کے ذرائع، علاقائی تاریخی پس منظر اور بین الطبقاتی احساس کی بدولت ہوتا ہے، اس اعتبار سے تمدن مختلف روایتوں میں اشتراکی اوصاف کی بدولت مجموعی شکل وصورت اختیار کرتا ہے۔"[۳۸] انیس ناگی کے نقطۂ نظر میں مرکزی روایت کا تصور ناپید ہے، اس لیے سلیم احمد اس کو تسلیم نہیں کرتے، کیوں کہ روایت کے معاملے میں وہ عسکری کے مقلد ہیں۔ لیکن عسکری اپنے تصورِ روایت کی رُو سے اردو کی جس ادبی روایت کی بات کرتے ہیں یا جس ادبی روایت کو وہ قائم کرنا چاہتے ہیں، شمس الرحمٰن فاروقی کے الفاظ میں "بہت تنگ تصویر اس روایت کی بنی۔ اس کے نتیجے میں انھیں تعبیر کی قلا بازیاں بھی کھانی پڑیں۔"[۳۹] روایت اور تخلیقی فنون کے تعلق کے حوالے سے انیس ناگی لکھتے ہیں:

"تخلیقی فنون کے حوالے سے روایت طرز احساس کا نام ہے۔ وسیع تر معانی میں طرزِ احساس کی اصطلاح ان تمام عناصر پر مشتمل ہے جو کسی فرد یا معاشرے کے کسی طبقے کے جذباتی ردِعمل میں یک جہتی پیدا کرتے ہیں۔ تمدن ایک

سے زیادہ طرزِ احساس کا مجموعہ ہوتا ہے، روایات اور تمدن دو سوتے ہیں جن سے تخلیقی فنون کی ندیاں پھوٹتی ہیں۔فن کار روایت کے ذریعے تمدن تک پہنچتا ہے، یعنی اس کے تصور تمدن میں اس کا تصور روایت اور وہ عصبیت بھی شامل ہوتی ہے جو اسے مخصوص نہج پر سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔''[۴۰]

سلیم احمد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کیوں صاحب اس تصور میں احساس اور جذباتی ردِعمل تو آ گیا مگر فکر کہاں گئی۔فکری عناصر، خیالات، معتقدات، اخلاقی اقدار، خود جمالیاتی اقدار یہ بھی تو روایت ہی کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔روایت صرف طرزِ احساس نہیں ہے، احساس، جذبہ اور ادراک کی کلیت ہے۔ بلکہ دراصل کچھ اس سے بھی زیادہ ہے کیوں کہ دراصل یہ روایت ہی ہے جو طرزِ احساس، جذبہ اور ادراک کا تعین کرتی ہے۔''[۴۱]

''نیا شعری افق'' پر لکھتے ہوئے سلیم احمد نے یہ اعتراف کیا ہے کہ میں یہ سطور انتقاماً لکھ رہا ہوں۔انتقام دوسروں سے نہیں اپنے آپ سے۔ لکھتے ہیں: ''میں اپنے آپ کو اس بات کی سزا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ ایک نوآموز ادیب اگر آج بُرا لکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کل اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا۔''[۴۲] اس کے باوجود سلیم احمد کے رویے میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی۔ وہ ہر بات کو لایعنی کہنے پر آمادہ ہیں۔انیس ناگی نے روایت کے سلسلے میں اگر کسی مسئلے کا تعین مختلف لفظوں میں کیا ہے تو اُنھوں نے فوراً ردِّعمل ظاہر کیا ہے۔ اس کی قوی مثال انیس ناگی کے متذکرہ بالا اقتباس پر اُن کا تبصرہ ہے۔ اُن کے اس رویے کا سبب یہ ہے کہ اُن کے فکر و نظر میں عسکری کا تصور روایت، عسکری ہی کے الفاظ میں سمایا ہوا ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا کوئی ایسا احساس ہوتا ہے جس میں ادراک کا عنصر نہ ہو اور اگر نہیں تو حقیقی معنوں میں ایسا کوئی ادراک بھی نہیں ہو سکتا جس میں احساس اور فکر کے عناصر نہ ہوں۔ ڈریش (Driesch) اپنی کتاب ''نفسیات کا بحران'' (The Crisis in Psychology) میں لکھتا ہے: ''ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ ہر ادراک ایک احساس بھی ہوتا ہے اور ایک فکر بھی۔ کوئی خیال کبھی احساس اور ادراک کے عناصر سے خالی نہیں ہوتا۔''[۴۳] کولرج نے اپنے متعلق لکھا ہے: ''اس کے احساسات و افکار کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے۔ دل و دماغ کی صفات اس کے اندر ایک دوسرے میں ایک غیر معمولی ردجے تک گندھی ہوئی تھیں۔''[۴۴]

مگر جب انیس ناگی یہ کہتے ہیں کہ روایت طرز احساس کا نام ہے جو فرد یا معاشرے کے کسی طبقے کے جذباتی ردِّعمل میں یک جہتی پیدا کرتے ہیں تو اس میں احساس، جذبہ اور ادراک تینوں شامل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ تخلیقی فنون کی اساس تخلیقی تجربہ پر ہوتی ہے اور تخلیقی تجربہ ایک عضویاتی کل ہوتا ہے جس کو اس کے اجزا میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔تخلیقی تجربے میں فن کار کی فکر، خیال، اعتقادات اور اخلاقی و جمالیاتی اقدار سبھی شامل ہوتے ہیں۔سلیم احمد کا کہنا ہے کہ یہ روایت ہی ہے جو طرزِ احساس، جذبہ اور ادراک کا تعین کرتی ہے۔اور انیس ناگی اس کو یُوں کہتے ہیں کہ فن کار کا روایت کا تصور اور عصبیت اُس کو ایک مخصوص نہج پر سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ دراصل سلیم احمد کے انیس ناگی کے تصورِ روایت پر سارے اعتراضات اس سبب سے ہیں کہ اُن کا روایت کا تصور مابعدالطبعیات سے مربوط نہیں ہے۔ انیس ناگی نے تو روایت کا اچھا بُرا تصور خود قائم کیا ہے جب کہ سلیم احمد مستعار فکر سے انیس ناگی کے اخذ کردہ نتائج کو مہمل قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔تصورِ روایت کے سلسلے میں انیس ناگی کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''روایت اور ماضی کا تعلق ناگزیر ہے کہ ماضی انسان کی سرگزشت ہے، زندہ اور مردہ ماضی میں فرق کیا جا سکتا ہے۔۔۔تخلیقی فنون میں ماضی کی شمولیت ناگزیر ہے مگر مسئلہ انتخاب اور اتصال کا ہے کہ فن کار ماضی کا ادراک کس طرح کرتا ہے اور اسے اپنے عہد سے کس طرح متصل کرتا ہے؟ ہمارے یہاں اردو ادب میں روایت کا تصور ماضی پرستی سے وابستہ ہے، بالخصوص شعری ادب میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ماضی کے شعری اُسلوب کے اعادہ اور تکرار سے فن کار روایت سے منسلک رہتا ہے، جو یہ فرض کرتے ہیں، وہ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں کہ روایت ایک حرکی عمل ہے جو خارجی حقائق کے تغیرات سے اپنے باطن میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔''[۴۵]

اب اس پر سلیم احمد کا تبصرہ سُنیے۔ وہ کہتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ روایت صرف ماضی نہیں ہوتی، جو روایت صرف ماضی بن کر رہ جائے وہ یقیناً مُردہ روایت ہوتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ روایت زمانے کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ روایت تو کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو زمانے کی تبدیلیوں میں اپنے تسلسل کو قائم رکھتی ہے اور ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔''[۴۶]

وہ مزید لکھتے ہیں:

''انیس ناگی صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ روایت ماضی کا اعادہ اور تکرار نہیں ہے۔ ایلیٹ نے بھی اس کی تردید کی ہے۔ مگر اعادہ اور تکرار اور چیز ہے اور باز آفرینی اور چیز۔ روایت اعادہ اور تکرار نہیں کرتی۔ نو بنو شکلوں میں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے۔''[۴۷]

سلیم احمد نے یہ تو تسلیم کیا ہے کہ انیس ناگی نے نظری طور پر تو جدید شاعری کے لیے ایک بنیاد فراہم کی ہے خواہ اس سے مجھے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ لیکن اکا دکا مصرعوں کو چھوڑ کر وہ اسے شاعری نہیں سمجھتے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان کے اعصاب پر عسکری کا تصورِ روایت سوار ہے اور دوسرا جدید شاعری اینگلو یورپی شعری روایت سے منسلک ہے۔ ان کے نزدیک اینگلو شعری روایت ہماری شعری روایت نہیں ہے۔ یہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے حصہ میں آئی ہے۔ انگریزوں کی آمد وہ واقعہ ہے جس سے ہماری روایتی تہذیب، روایتی معاشرہ اور روایتی شاعری ختم ہو کر ایک قطعاً غیر روایتی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ سلیم احمد جدید شاعری کو شاعری سمجھیں یا نہ سمجھیں، حقیقت یہ ہے کہ جدید شاعری نے نو بہ نو جلوؤں سے اُردو شاعری کو نئی منزلوں سے آشنا کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۶۳۸

۲۔ ایضاً، ص ۶۳۵۔ ۶۳۶

۳۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، کراچی، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۴۰۰

۴۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ، ص ۶۳۷ ۵۔ ایضاً، ص ۶۳۷

۶۔ ایضاً، ص ۶۳۸ ۷۔ ایضاً، ص ۶۳۸

۸۔ سلیم احمد، نئی شاعری نامقبول شاعری، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۴

۹۔ بہ حوالہ ایلیٹ کے مضامین، جمیل جالبی (مترجم)، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۸۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۱۱۔ حامدی کاشمیری، اکتشافی تنقید کی شعریات، کمپیوٹرسٹی، راج باغ، سری نگر، کشمیر، نومبر ۱۹۹۹ء، ص ۵۲

۱۲۔ ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)، ص ۴۰۰

۱۳۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، مغرب کے تنقیدی اصول، ص ۳۲۵

۱۴۔ بہ حوالہ ایلیٹ کے مضامین، جمیل جالبی (مترجم)، ص ۱۸۴

۱۵۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ، ص ۶۳۹

۱۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی، محمد حسن عسکری —— کل اور آج (ایک گفت گو)، مشمولہ محمد حسن عسکری اور معاصر تنقید، مرتب، اشتیاق احمد، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۱۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۱۲ ۱۸۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ، ص ۶۳۹

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۳۹۔۶۴۰ ۲۰۔ ایضاً، ص ۶۴۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۶۴۵ ۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱۸۲

۲۳۔ سلیم احمد، نئی شاعری نامقبول شاعری، ص ۱۴۔۱۵

۲۴۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، جستجو، القمر انٹر پرائزز، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۹۵

۲۵۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ، ص ۶۳۷

۲۶۔ بہ حوالہ محمد حسن عسکری اور معاصر تنقید، ص ۳۱۲

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۱۳ ۲۸۔ ایضاً، ص ۳۱۴

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۱۵ ۳۰۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ، ص ۸۲۵

۳۱۔ ایضاً، ص ۸۲۵ ۳۲۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، جستجو، ص ۱۸۹

۳۳۔ بہ حوالہ محمد حسن عسکری اور معاصر تنقید، ص ۸۴۔۸۵

۳۴۔ انیس ناگی، نیا شعری اُفق، جمالیات، لاہور، دوسری اشاعت، ۱۹۸۸ء، ص۲

۳۵۔ سلیم احمد، نیا شعری اُفق، مشمولہ نیا دور، کراچی، شمارہ نمبر ۵۷۔۵۸، ص۹۵

۳۶۔ انیس ناگی، نیا شعری اُفق، ص۲

۳۷۔ سلیم احمد، نیا شعری اُفق، ص۹۵

۳۸۔ انیس ناگی، نیا شعری افق، ص۲

۳۹۔ بہ حوالہ محمد حسن عسکری اور معاصر تنقید، ص۳۱۶

۴۰۔ انیس ناگی، نیا شعری افق، ص۲

۴۱۔ سلیم احمد، نیا شعری اُفق، ص۹۵۔۹۶

۴۲۔ ایضاً، ص۹۱

۴۳۔ بہ حوالہ مغربی شعریات، محمد ہادی حسین، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۱۷۴

۴۴۔ ایضاً، ص۱۷۴

۴۵۔ انیس ناگی، نیا شعری اُفق، ص۴

۴۶۔ سلیم احمد، نیا شعری اُفق، ص۹۶

۴۷۔ ایضاً، ص۹۶